

پروین شاکر (محبت کی کہانی-نسوانی آواز میں)

ڈاکٹر عقیلہ جاوید*

Abstract:

This article deals with the poetry of Parveen Shakir in a new context. In the western tradition a feminism voice has been considered essential for the expression of the feeling of a women. So it is not a simple thing that if our female writers went to discover in a different way and the critics also was to discover this voice in the context of feminism.

خوشبو کا م لیں تو ایک لطیف سا احساس ہوتا ہے۔ دھیان جہاں پھولوں کی طرف منعکس ہوتا ہے۔ وہاں دوسری طرف ایک خوبصورت شاعرہ کی یاد بھی دل میں انگڑائی لیتی ہے۔ پروین شاکر* کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ جملہ پروین شاکر کی انفرادیت کو اجاگر نہیں کرتا۔ کیوں کہ بے شمار شعرا ہیں جن کے نام تعارف کے محتاج نہیں۔ یہاں مجھے یہ کہنا چاہیے کہ پروین شاکر کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ جملہ پروین کی انفرادیت ظاہر کرتا ہے۔ کیوں کہ یہ جملہ ہم عموماً شعراء کے متعلق نہیں لکھ سکتے۔ برسوں بیت جاتے ہیں لیکن پھر بھی ہم کسی شاعر کے کلام سے مکمل طور پر متعارف نہیں ہو پاتے۔ اس کی وجہ یقیناً یہی ہو سکتی ہے کہ شاعر انہونی واردات کے زیر اثر انوکھے انداز میں لایعنی گتھیوں کے پیچ و خم میں خود الجھتا ہے اور قاری کے ہاتھ میں الجھی ہوئی ریشم کی گیند کا بمشکل ایک سراہی ہاتھ لگتا ہے۔ ایسے میں نقاد تنوع، الجھاؤ، کشمکش، لفظوں کا ہیر پھیر، جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کلام کی گرہیں کھولنے کی سعی شروع کر دیتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سعی لا حاصل ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ فلاں شاعر گھمبیر لہجے میں بات کرتا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے فلاں شاعر کے ہاں فلسفیانہ موٹنگافیاں ہیں۔ یا یہ کہ فلاں صنعتوں کی شعبہ بازی کا کھلاڑی ہے یا وہ روایت کی پاسداری کرتا ہے یا پھر روایت کو توڑتا ہے۔ لیکن پروین شاکر کے ساتھ معاملہ دوسرا ہے۔ پروین محبت کی شاعرہ ہے اور محبت پیار کی خوشبو ہے۔ محبت انسان کو الجھاتی نہیں بلکہ رہنمائی کرتی ہے۔ محبت سے ہر عمر کا انسان واقف ہے۔ یہ جذبہ رنگ، نسل اور عمر سے ماورا ہے۔ ہر جاندار اسے محسوس کرتا ہے۔ بس اسے بیان کرنے کا انداز منفرد اور جدا ہوتا ہے۔ پروین شاکر نے اس جذبے کو اتنا گہرائی اور سچائی سے بیان کیا ہے کہ تمام شعری تجربے کا تار و پود اس کے گرد بٹنا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پروین شاکر سے پہلے عشق و محبت کے موضوع پر

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

بے شمار طبع آزمائی ہوئی۔ مردوں نے اسے اپنی جاگیر خاص سمجھتے ہوئے اسے اس طرح برتا کہ بعد میں آنے والی خواتین کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ بھی اگر اس جذبے کو اپنائیں تو نسوانی لب و لہجے سے بچتے ہوئے مردانہ انداز میں جذبے کو پیش کریں۔ عشق اور ہوس میں کبھی فرق سمجھا ہی نہیں گیا۔ محبوب کا لباس، محبوب کی ادائیں، محبوب کی شکل و صورت، ہجر و وصال کے لمحات کا ڈرامائی انداز۔ بس یہ عشق یا قلبی واردات کی مکمل داستان تھی جس کے مضامین کو سوسو طرح سے باندھا گیا اور غزل کا مطلب ہی عورتوں سے باتیں کرنا مراد لیا گیا۔ گویا یہ مقالہ لکھنے کا وہ خاکہ تھا جو قدرے کمی بیشی کے بعد ہر غزل گو نے یوں اپنایا کہ اسے اپنا ذاتی تجربہ قرار دے کر مختلف رنگ بھر دیا گیا۔ جذبہ چوں کہ مستعار لیا گیا لہذا ان کے پاس جو میدان رہ گیا وہ محض لفظوں کا ہیر پھیر تھا۔ جس کے گورکھ دھندوں میں آنے والے الجھتے رہے۔

اُردو ادب کے ابتدائی دور میں عورت کا تصور بالکل روایتی تھا۔ یعنی وہ ایک نمائشی حیثیت رکھتی تھی یا پھر اس سے قربانی کی توقع رکھی جاتی تھی گویا اسے پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ مردوں کا دل بہلائے اور ان کے عیش و عشرت اور شہوانی خواہشات کی تکمیل کے بعد ان پر سے قربان ہو جائے۔ عورت مرد کے نزدیک ایک خوبصورت مجسمہ تھی جس سے وہ لطف اندوز تو ہوتا تھا لیکن اس کے باطن میں جھانکنے یا اُس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا نہ تو اسے ارمان تھا اور نہ احساس۔ عورت کے جذبات کی ترجمانی نہ وہ کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کا مقصد تھا۔

ابتدائی اردو شاعری سراپا نگاری سے عبارت تھی جس میں عورت محبوبہ کے روپ میں سامنے آتی ہے اگرچہ ہندی اور سنسکرت شاعری میں عورت کا جو تصور ابھرتا ہے وہ بہت انوکھا ہے کیوں کہ کم از کم شاعری کی حد تک ان کے خیالات و احساسات اخلاقیات اور روحانیت کے حامل رہے لیکن جب اردو شاعری میں تخیلی محبوبہ کو پیش کیا گیا تو اکثر جگہ ادب ابتداء کا شکر ہو گیا۔

اس سب سے ہٹ کر عورت جہاں شعر و ادب کا موضوع بنی وہاں ادب خود اس کی خاص قلمرو بھی رہا ہے۔ لیکن باقر مہدی کی یہ رائے بھی وقیع ہے کہ

”اردو شاعری کی تعریف میں کوئی ایمپلی ڈکنس یا اس طرح کی کوئی بھی اہم شاعرہ نہیں ہونیں اور غزل کی حکمرانی میں عورتوں پر تغزل کے دروازے اس طرح بند کئے تھے کہ وہ جانِ غزل بن سکتی تھی مگر خود غزل گو نہیں بن سکتی تھی۔“

(خاموشی کی آواز، ص ۱۶۱)

دراصل اردو ادب اپنی ترقی پسند تحریک اور جدید رجحانات کے باوجود نہایت دقیقاً نوسی اور روایتی رہا ہے۔ خود ترقی پسند اور جدید ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں عورت کی جذباتی اور معاشرتی کشمکش کو مسخ کر کے پیش کرتی رہی ہیں اس کے جسم کو اہمیت دی گئی مگر اس کے ذہن اور تخلیقی صلاحیتوں کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا۔ ایسے میں پروین شاکر جیسی شاعرات نے بطور عورت جو نسوانی آواز بلند کی اس میں اس کے جذبات خیالات کے آئینے میں ڈھل کر سماعت پذیر ہوتے ہیں۔

پروین شاکر کی غزل میں عشق و محبت کے وہ فرسودہ مضامین نہیں ملتے۔ سب سے پہلے تو وہ اس تجربے سے خود گزرتی ہیں پھر وہ نسوانی جذبات کی ترجمانی اس اعلیٰ درجے کی کرتی ہیں کہ محبت سے وہ خود ہی سرشار نہیں ہوتیں بلکہ یہ سرشاری قاری تک منتقل ہوتی ہے۔ روایت اور سماجی رویے کے برعکس وہ نسوانی اظہار پر شرمندگی محسوس نہیں کرتیں بلکہ فخر سے اعتراف محبت کرتی ہیں۔ یوں محبت کے معاملے میں وہ حقیقت پسند شاعرہ کے روپ میں ہمارے سامنے آئی ہیں۔

خوشبو کے فلیپ پر ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

”پروین کی غزلوں میں غزل کے پیکر کا احساس ہے اس کی ایک وجہ پروین کی نسوانی بصیرت ہو سکتی ہے جس نے غزل کو ایک کومل لڑکی کے روپ میں دیکھ لیا ہے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کیوں کہ ادب کی بنیاد انسانی جذبات و احساسات پر رکھی گئی ہے اور اس کے ڈانڈے زندگی سے ملے ہوئے ہیں اس لئے ہر قوم اور ملک کی خواتین نے اس شعبہ حیات کو اپنی ضیا پاشیوں سے منور کیا ہے۔ یہاں میں کہتی جاؤں کہ پروین شاکر سے پہلے کم از کم محبت کے حوالے سے اتنا حقیقت پسندانہ رویہ کسی شاعر کے ہاں موجود نہیں۔ کیوں کہ اس خازن میں ننگے پاؤں چلنے کا حوصلہ وہ دیوانگی مانگتا ہے جس پر فرزانگی کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ اور نفع نقصان کو بالائے طاق رکھ کر اشکوں سے سودا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ آہوں کو دانا بھی پڑتا ہے۔ دہلی کے مجتبیٰ حسین پروین شاکر کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

”نسوانی جذبات کا ٹھیٹ اور شائستہ اظہار ہمیں صرف پروین شاکر کی شاعری میں ملتا ہے۔ محبت ایک ازلی جذبہ ہے۔ اس جذبے کو ابتدائے آفرینش سے فنکاروں نے اپنی تخلیقات میں برتا، پرکھا اور پیش کیا لیکن یہ جذبہ جب پروین

شاکر کی شاعری میں نکھرتا ہے تو اس کی چمک دمک سب سے مختلف اور منفرد دکھائی دیتی ہے۔“

(”میں سمندر دیکھتی ہوں تم کنارہ دیکھنا“، ص ۴۱۲، مشمولہ خوشبو کی ہمسفر)

گویا محبت کی سچی کہانی شاعری کی صورت میں ڈھلتی ہے تو اپنی پوری جزئیات سمیت لفظوں کے سہارے بھر پور انداز میں بے نقاب ہو کر توانا رنگوں کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ نہ معذرت خواہانہ لب و لہجہ، نہ رقیبانہ جلاپا، نہ فرسودہ لفاظی، نہ کھل کھیلنے کا انداز۔ بس صاف، سچی اور سیدھی بات کرتی ہیں جو اسی سیدھے سادے انداز میں قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔ وہ خود کہتی ہیں:-

”شاعری میں میں صداقت کی قائل ہوں۔ تصنع شاعری کے لباس پر ایسی

آرائش ہے جو نظر کو شاید بھلی لگے لیکن دل پر بڑا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔“

پروین شاکر از سلطانہ مہر، ص ۱۶۱، مشمولہ خوشبو کی ہمسفر

منزعم اور چھوٹی بحریں ان کے جذبے کی لئے کو بہت اچھے طریقے سے قاری تک منتقل کرتی ہیں۔ چونکہ قدرت نے عورت کے جذبات میں بے پناہ شدت رکھی ہے اس لئے اگر یہ کہا جائے بے جا نہ ہوگا کہ عورتوں کی زبان کی بنیاد ہی جذبات نگاری پر پڑی اور ان کی زبان میں جذبات نگاری اور زور بیان کے لئے الفاظ کا جس قدر بڑا ذخیرہ ملتا ہے کسی ادیب یا شاعر کے ہاں نہیں ملے گا کیوں کہ عورت ایک طرف جذبات کا مخزن ہے دوسری طرف الفاظ کی خالق۔ پروین شاکر کے ہاں عشق و محبت پر مبنی یہ مکمل کہانی ان کے شعروں میں یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ ایک مشرقی لڑکی ہے جو سماجی اقدار کی نفی کا حوصلہ نہیں رکھتی جب پہلے پہل اُس کے دل میں ایک خوبصورت احساس جاں گزریں ہوتا ہے تو اس احساس کو وہ کس طرح زبان دیتی ہے جس سماج میں محبت کرنا جرم شمار ہوتا ہے وہاں یہ کیفیت کس قدر حسہ حال ہے:-

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کر تنہائی میں

میرے چہرے پہ تیرا نام نہ پڑھ لے کوئی

(خوشبو، ص ۴۷)

لیکن جب یہ احساس جذبے میں ڈھل جائے تو پھر پہلا پل بھلائے نہیں بھولتا اور سب سے پہلے نیند رخصت ہوتی ہے:-

آنکھ کو یاد ہے وہ پل اب بھی
نیند جب پہلے پہل ٹوٹی تھی
(خوشبو، ص ۳۱۱)

بظاہر بات تو بہت چھوٹی سی ہوتی ہے لیکن نیند کے پہلے پہل ٹوٹنے سے لے کر بات کرنے کے درمیان تک
کئی مرحلے ہوتے ہیں جنہیں طے کیا جانا ہوتا ہے۔ مرد اپنی تمام تر حیات سے کام لے کر بھی عورت کی اس کشمکش
سے واقف حال نہیں ہو سکتا کہ

وہ اب میری ضرورت بن گیا ہے
کہاں ممکن رہا اس سے نہ بولوں
(خوشبو، ص ۳۰۷)

یہ لڑکی اعتراف محبت کے اس کٹھن مرحلے سے بھی گزرتی ہے جب:-
ایسے موسم بھی گزارے ہم نے
صبحیں جب اپنی تھیں شامیں اس کی
(خوشبو، ص ۴۴)

محبت وہ شدید جذبہ ہے جس میں یا تو محبوب میں ضم ہو کر اپنی انفرادیت تہ تیہ دینی ہوتی ہے یا محبوب کو اپنا بنا کر
خود میں سمو دینا ہوتا ہے کچھ اسی کیفیت کا اظہار پروین شاکر کے اس شعر میں ہوتا ہے:-
حل ہو گیا خوں میں کچھ ایسے
رگ رگ میں وہ نام بہہ رہا ہے
(خوشبو، ص ۲۵۹)

محبت کی سرشاری میں وہ لمحہ بھی آتا ہے جب وقت کے گزرنے کا احساس نہیں رہتا۔ یوں لگتا ہے ایک معصوم
لڑکی ہاتھ کی پیالی میں ٹھوڑی رکھے اپنے محبوب سے باتیں کرنے میں مگن ہے اور
دوپہر شام ہوئی شام شپ تار ہوئی
اور کھلتے رہے کھلتے رہے باتوں کے گلاب
(ماہِ تمام، ص ۱۴۸)

ایسے میں زماں کا حقیقی تصور مٹ جاتا ہے وقت بھی جذبے کا اسیر ہو جاتا ہے:
اس کے وصل کی ساعت ہم پر آئی تو جانا
کس گھڑی کو کہتے ہیں خواب میں بسر ہونا
(ماہ تمام، ص ۷۶)

محبت میں ہار جیت کے اپنے اصول ہوتے ہیں یہاں نسوانیت کا غرور ہی اس کی ہار میں پوشیدہ ہے اس ہار
میں جیت کا مزہ چھپا ہے جسے ایک مشرقی لڑکی سے زیادہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا:-
میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لا جواب کر دے گا
(خوشبو، ص ۲۰۵)

پروین شاکر کی شاعری کی یہ پھول چنتی، چڑیوں کی آواز سنتی ہر اسان ہر اسان لڑکی ہمیں اپنے دل سے
قریب محسوس ہوتی ہے۔ جب وہ معصومیت سے اپنی خواہشات کا اظہار کرتی ہے۔
وہ روز آ کے مجھے اپنا پیار پہنائے
میرا غرور ہے نیلے کے ہار کا موسم
(خوشبو، ص ۲۱۴)

چاند اس دلیں میں نکلا کہ نہیں
جانے وہ آج بھی سویا کہ نہیں
(خوشبو، ص ۲۰۲)

میں تو اس دن سے ہر اسان ہوں کہ جب حکم ملے
خشک پھولوں کو کتابوں میں نہ رکھے کوئی
(خوشبو، ص ۴۷)

یہ لڑکی رقیب نہیں پالتی بلکہ اپنی جیسی کچھ سہیلیوں سے راز و نیاز کرتی ہے اور اپنی سہیلیوں کا ہی رنگ روپ
اپناتی ہے۔

وہ رُت بھی آئی کہ میں پھولوں کی سہیلی ہوئی
مہک میں چمپا کلی ، روپ میں چمیلی ہوئی
(خوشبو، ص ۵۰)

اور پھر اس لڑکی کو بہلانا بھی بہت آسان ہے۔ کیونکہ اس کی خواہشات انوکھی ضرور ہیں مگر محدود بھی ہیں
عاشق کے ہاں ہجر سب سے مشکل مرحلہ شمار ہوتا ہے مگر یہاں تنہائی کے لئے کیا اچھا سہارا تلاش کیا ہے:-

وہ چاند بن کر میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اس کے ہجر کی راتوں میں کب اکیلی ہوئی
(خوشبو، ص ۵۰)

”خوشبو“ کے دیباچے میں پروین خود لکھتی ہیں کہ:-

”اگر محبت تقاضائے جسم و جان سے ماورا ہو جائے تو الہام بن جاتی ہے“
پھراتنی توانا یادوں میں وصل کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ محبوب کو اچانک رو برو پا کر حیرانی ہوتی ہے۔
دروازہ جو کھولا تو نظر آئے کھڑے وہ
حیرت ہے مجھے آج کدھر بھول پڑے وہ
(خوشبو، ص ۸۶)

امجد اسلام امجد کے بقول:

”پروین کی شاعری میں آپ کو ایک عورت سے زیادہ ایک لڑکی کی آواز سنائی
دے گئی۔ ایک ایسی لڑکی کی آواز جو خوبصورت پھول چننا بھی جانتی ہے اور انہیں
گلدان میں سجانا بھی۔“

(امجد اسلام امجد، فلیپ ”خوشبو“)

اپنے معصومانہ انہماک میں اس نے کیا کچھ کھود دیا یہ تو اس کے تصور سے بھی پرے کی بات ہے۔ چاند اور
پھول کی دیوانی لڑکی کے ساتھ ایسا ہونا غیر فطری نہیں کہ:-

میں پھول چنتی رہی اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ شخص آ کے میرے شہر سے چلا بھی گیا
(خوشبو، ص ۹۸)

روایتی شعرا کے ہاں ایسے موقع پر آہ و فغاں بلند ہوتی ہے جگر کا خون ہوتا ہے کبھی کبھی دشنام طرازی تک نویت آپہنچتی ہے۔ مگر پروین شاکر کو اپنا عورت ہونا نہیں بھولا لہذا یہاں بھی نسوانی آواز بلند ہوتی ہے۔

کہیں رہے وہ مگر خیریت کے ساتھ رہے

اٹھائے ہاتھ تو یاد ایک ہی دعا آئی

(خوشبو، ص ۱۵۰)

محبت میں سرشاری کے بعد جب ہجر و فراق کے لمحات آتے ہیں تو دلوں میں بے پناہ خدشات بھی جنم لیتے ہیں۔ روایتی انداز کی شاعری میں ایسے موقعوں پر تقدیر کا گلہ کیا جاتا ہے، مقدر کو برا بھلا کہا جاتا ہے مگر یہاں تو ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے جو زیر غور ہے کہ:-

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا

مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا

(خوشبو، ص ۱۸۵)

ہمارے سماج میں لڑکی کو بہت زیادہ نوازا نہیں جاتا۔ پروین کو عورت ہونے کے ناتے اپنے مقام سے پوری طرح آگاہی ہے۔ اس لئے اُن کی طلب بہت زیادہ نہیں وہ تو بس یہ چاہتی ہے

چہرہ نہ دکھا، صدا سُنا دے

جینے کا ذرا تو حوصلہ دے

(خوشبو، ص ۲۶۲)

اور یہ حوصلہ جب انتہا کو پہنچتا ہے تو آنکھوں کی آسودگی کے لئے خواہش کا اظہار یوں شعر میں ڈھلتا ہے کہ:-

دکھلا کسی طور اپنی صورت

آنکھوں کو مزید مت سزا دے

(خوشبو، ص ۲۶۲)

اُردو شاعری میں محبوب کی آنکھوں کی ہمیشہ تحسین کی گئی ہے۔ بڑی، غزالی، کا جل سے سچی، بادامی، سرگیں، شرمیلی نگاہیں ہمیشہ شعراء کی داد کا باعث بنیں۔ پروین شاکر کی شاعری میں بھی آنکھوں کا لفظ تو اتر سے آیا ہے مگر انداز روایتی نہیں۔ اُن کے ہاں آنکھیں جو محبت میں بولتی ہیں کیوں کہ سماج ہونٹوں پر مہر لگا دیتا ہے ایسے میں پیغام آنکھوں

کی زبان سے دیا جاتا ہے۔

زبان سے چپ ہے مگر آنکھ بات کرتی ہے
نظر اٹھائی ہے جب بھی تو بولتا ہی لگا
(خوشبو، ص ۱۵۶)

بہت عزیز ہیں آنکھیں میری اُسے لیکن
وہ جاتے جاتے انہیں کر گیا ہے پُر نم پھر
(خوشبو، ص ۱۶۲)

اس کی آنکھیں بھی کہے دیتی تھیں
رات بھر وہ بھی نہیں سویا لوگو
(خوشبو، ص ۵۲)

خود کرے تیری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
یہ آنکھیں جن کو کبھی دکھ کا حوصلہ نہ ہوا
(خوشبو، ص ۷۵)

پروین محبت کے سوز و گداز سے متاثر ہوتی ہیں لیکن جل کر خاکستر نہیں ہوتیں بلکہ اپنی محبت کو آزمانے کا رویہ اپناتی ہیں۔

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دلہن سجاؤں گی
(خوشبو، ص ۲۰۹)

دل پہ اک طرفہ قیامت کرنا
مسکراتے ہوئے رخصت کرنا
(خوشبو، ص ۱۱۶)

کیا کسی مرد نے آج تک اپنے محبوب کو یوں رخصت کیا

لو! میں آنکھیں بند کئے لیتی ہوں، اب تُم رخصت ہو
دل تو جانے کیا کہتا ہے، لیکن دل کا کہنا کیا
(خوشبو، ص ۹۷)

اب تک شعراً ہمیشہ دل کا کہا مانتے رہے۔ اس لئے کبھی کوئی راہ انہیں سوجھی ہی نہیں۔ یوں گم گردہ راہ
رہے۔ منزل بے نشان کا پتہ بھلا دل غریب کیا جانے حیرت ہوتی ہے اس کمزوری لڑکی کی ہمت پر
سپرد کر کے اُسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں گھر کے اندھیروں کو لوٹ آؤں گی
(خوشبو، ص ۲۰۹)

بلکہ کہیں کہیں تو اپنے آپ کو الزام دے کر محبوب کو بری الذمہ قرار دیتی ہیں لیکن ایسا تب ہوتا ہے جب محبوب
کا کردار وہ خود ادا کرتی ہیں۔

عشق تو خیر تھا اندھا لڑکا
حسن کو کون سی مجبوری تھی
(خوشبو، ص ۳۱۱)

ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے
اُس کا ہی قصور سارا کب تھا
(ماہ تمام، ص ۱۵)

کچھ تو تھی میری خطا ورنہ وہ کیوں
بے سبب ترک رفاقت کرتا
(ماہ تمام، ص ۲۸)

محبت کی کہانی میں کڑا وقت وہ ہوتا ہے جب کسی کو الوداع کہہ کر ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا جائے۔ ظاہر
ہے دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن بعض اوقات لبوں پر مسکراہٹ سبجانی پڑتی ہے۔ ان لمحات کو پروین شاکر نے اپنی
شاعری میں اُمر کر دیا ہے۔

یوں بچھڑنا بھی بہت آسان نہ تھا اُس سے مگر
جاتے جاتے اُس کا وہ مڑ کر دوبارہ دیکھنا
(ماہِ تمام، ص ۲۴۱)

رخصت کرنے کے آداب نبھانے ہی تھے
بند آنکھوں سے اُس کو جاتا دیکھ لیا ہے
(ماہِ تمام، ص ۵۵)

لیکن زیادہ عرصے کے لیے آنکھیں بند بھی نہیں رکھی جاسکتیں اور جب آنکھ کھلے تو حقیقت کا ادراک ہوتا
ہے۔ سوچ جب فکر کا روپ دھارتی ہے تو چند سوال سامنے آکھڑے ہوتے ہیں:-

ایسا کیوں کہ جانے سے صرف ایک انسان کے
ساری دنیا ہی بے ثبات ہو جائے
(ماہِ تمام، ص ۱۳۰)

اور اس کے بعد یاد زندگی گزارنے کا ایک خوبصورت سہارا بنتی ہے۔ یاد صرف تلخی لیے ہوئے ہی نہیں آتی
بلکہ کبھی کبھار یوں بھی آتی ہے

یاد کرتا جائے دل اور کھلتا جائے دل
اوس کی طرح کوئی پات پات ہو جائے
(ماہِ تمام، ص ۱۳۰)

کوئی ستارہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا
سفر میں جیسے ہی مجھ کو تیرا خیال آیا
(ماہِ تمام، ص ۲۲۶)

اپنے لئے یاد کا انداز اور ہے اور محبوب کے لئے یاد کا لفظ اور معنی لئے ہوئے ہے۔ پس پردہ محبوب کے ظرف
سے بھی آگا ہی ہے:-

تیرے ہی بھلے کو چاہتی ہوں
میں تجھ کو کبھی نہ یاد آؤں
(خوشبو، ص ۳۱۹)

جبکہ اپنے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ

یاد کیا آئی کہ روشن ہو گئے آنسو کے گھر
جنگلوں میں شام اتری، جل اٹھے جگنو کے گھر

(خوشبو، ص ۲۳۵)

یہ یاد رفتہ رفتہ خواب کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ تعلقات بھی کبھی کبھی خواب و خیال ہو جاتے ہیں:-

آنکھوں نے یہ جان لیا ہے کہ کوئی شخص
اک خواب تھا کہ عرصہ جاں سے نکل چکا

(ماہ تمام، ص ۲۳۸)

ڈسنے لگے ہیں خواب مگر کس سے بولنے
میں جانتی تھی، پال رہی ہوں سپنو لئے

(خوشبو، ص ۲۳۰)

لیکن اس کے باوجود یہ خواب اس لئے عزیز ہیں کہ زندگی کے اندھیروں میں یہ واحد روشنی کا ذریعہ ہیں:-

اس خواب کی لو کو مت بھگانا

یہ میرا چراغ نیم شب ہے

(ماہ تمام، ص ۱۳۷)

ایک شب گزیدہ شخص ہی بتا سکتا ہے کہ چراغ نیم شب کی اہمیت کیا ہے۔ مختصر اُپروین شاکر کی شاعری میں
محبت سب سے بڑا تجربہ ہے اور اس کی کائنات کا مرکز و محور ہے۔ اپنی ذات سے ماورا ہو کر کسی اور ذات کے لئے
اپنے آپ کو توجہ دینے کا احساس اور اس میں سرشاری یہی اس کی جیت ہے۔ محبت کی یہ کہانی جہاں ایک نسوانی آواز کی
انفرادیت ہے وہاں دیگر شعراء کے لئے ایک کھلا چیلنج بھی ہے کہ وہ چاہیں بھی تو عورت کی محبت کی اس وسعت کو اپنے
اندراجہ نہیں دے سکتے جو بطور متا صر ف اسی کا مقدر ہے اور وہ اس وسعت میں تمام رشتے سمو لیتی ہے۔

سب ضدیں اس کی میں پوری کروں، ہر بات سنوں

ایک بچے کی طرح سے اُسے ہنتا دیکھوں

(خوشبو، ص ۶۰)

بلاشبہ یہ محبت کی کہانی دروغ گوئی سے مبرا ہے۔

ماخذات و حواشی

- ۱۔ پروین شاکر، ”خوشبو“، غالب پبلشرز، لاہور، نومبر ۱۹۷۷ء
 - ۲۔..... ایضاً.....، ”صد برگ“، التحریر اردو بازار، لاہور، فروری، ۱۹۸۰ء
 - ۳۔..... ایضاً.....، ”خودکلامی“، مکتبہ فنون، لاہور، اپریل ۱۹۸۵ء
 - ۴۔..... ایضاً.....، انکار، ایضاً، ۱۹۹۰ء
 - ۵۔..... ایضاً.....، ”کف آئینہ“، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
 - ۶۔..... ایضاً.....، ماہ تمام (کلیات) مراد پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء
 - ۷۔ عالیہ جلیل شاہ، ”تہا چاند“، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء
 - ۸۔ ”خوشبو کی ہمسفر“، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، لفظ لوگ، پبلی کیشنز، اسلام آباد، اپریل ۲۰۰۲ء
- ☆ پروین شاکر ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ شعری سفر کا آغاز دوران طالب علمی سرسید کالج کراچی میں ۱۹۶۸ء سے ہوا۔ ابتدائی تخلص بینا اور بعد ازاں پروین اختیار کیا۔ پہلا شعری مجموعہ ”خوشبو“ کے نام سے نومبر ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ”صد برگ“، فروری ۱۹۸۰ء، ”خودکلامی“، ۱۹۸۵ء، ”انکار“، ۱۹۹۰ء اور چاروں شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات ماہ تمام کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔
- جامعہ کراچی سے ایم اے انگریزی ادبیات ۱۹۷۲ء میں اور ایم اے (لسانیات) ۱۹۸۰ء میں کیا۔ سی ایس ایس ۱۹۸۱ء میں کیا جس میں پاکستان بھر میں دوسری پوزیشن لی۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۲ء تک تعلیم کے سلسلے میں امریکہ مقیم رہیں۔ بے شمار اعزازات حاصل کئے۔ انتقال سے پہلے ڈپٹی ڈائریکٹر (انسپکشن اینڈ ٹریننگ، کسٹم اینڈ سنٹرل ایکسائز، اسلام آباد) میں فرائض منصبی ادا کر رہی تھیں کہ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء میں ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہو کر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں۔
- ☆☆ احمد فراز پر ایک مضمون میں پروین شاکر نے لکھا ہے کہ ”جس معاشرے میں الزام کی تصدیق کے بغیر تعلقات ختم کرنے کی رسم ہو وہاں کسی شخص کی بے وفائی کا جواز ڈھونڈ لانا بڑے حوصلے کی بات ہے“ متعلقہ اشعار ان کے اس بیان کی ترجمانی کرتے ہیں۔